HJRS HEC Journal Recognition System

AL-HAYAT RESEARCH JOURNAL

AL-HAYAT Research Journal

ISSN (Online): 3006-4767
ISSN (Print):: 3006-4759

Volume 3 Issue 2 Jan-March 2026)

عالمی قوانین پر اسلامی تعلیمات کے اثرات

Assessing the Impact of Islamic Jurisprudence on Contemporary International Law

Nasira Bukhari
Ph.D Scholar, National College of Business Administration & Economics Lahore (AlHamra University) Sub Campus Bahawalpur. nasira35876@gmail.com

Dr. Abrar Mohyuddin
Assistant Professor, National College of Business Administration & Economics Lahore (AlHamra University) Sub Campus Bahawalpur. abrarmohiuddin@gmail.com

Abstract

This research article explores the profound and multifaceted influence of Islamic teachings on the evolution and structure of modern international law. While contemporary global legal frameworks are often viewed through a Western-centric lens, this study contends that the foundational principles of Siyar (Islamic International Law) have historically contributed to, and pre-empted, many core tenets of modern humanitarian and diplomatic conduct.

The analysis delves into several critical dimensions, including the Islamic doctrine of jus in bello (laws of war), which emphasizes the protection of non-combatants, environmental preservation during conflicts, and the ethical treatment of prisoners of war—principles that align closely with the Geneva Conventions. Furthermore, the paper examines the Islamic emphasis on the sanctity of treaties (Ahd), the concept of global justice, and the egalitarian framework of human rights that challenges the conventional Westphalian sovereignty model.

By synthesizing classical Islamic legal texts with modern international legal instruments, this article demonstrates that Islamic jurisprudence offers a sophisticated, moral, and universalistic approach to global governance. The findings suggest that integrating Islamic legal ethics can provide a more inclusive and pluralistic foundation for addressing 21st-century global challenges, fostering a synthesis between divine justice and secular legal frameworks.

Keywords: *Islamic Jurisprudence (Fiqh), International Humanitarian Law, Siyar (Islamic Law of Nations), Global Governance, Human Rights, Treaty Obligations (Ahd), Ethical Warfare, Legal Pluralism, Diplomatic Immunity*

تمہید

عالمی قوانین کی تاریخ کے بارے میں بعض ماہرین یہ رائے دیتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون کا آغاز یورپ میں چند صدیوں پہلے ہوا، لیکن یہ نقطۂ نظر مکمل طور پر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوام کے درمیان تعلقات، جنگ و امن کے اصول، اور باہمی معاہدات کا تصور انسانی تاریخ میں بہت قدیم ہے، جو اسلام سے بھی پہلے مختلف شکلوں میں موجود تھا۔

قدیم زمانے میں مختلف قبائل اور قوموں کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں، مگر ان کے ساتھ ساتھ جنگ بندی اور صلح کے معاہدے بھی کیے جاتے تھے۔ اگرچہ اس دور میں باقاعدہ تحریری قوانین یا منظم ضابطۂ اخلاق موجود نہیں تھا، پھر بھی کچھ بنیادی اصول لوگوں کے ذہنوں میں راسخ تھے۔ ان اصولوں پر مکمل عمل ہمیشہ ممکن نہ تھا اور بعض اوقات دھوکہ دہی اور بدعہدی بھی دیکھنے میں آتی تھی، لیکن اس کے باوجود معاشرتی سطح پر کچھ اقدار اور اصولوں کو تسلیم کیا جاتا تھا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔

OPEN ACCESS
CC BY

تاریخی کتب میں ایسے کئی معاہدات کا ذکر ملتا ہے، جن میں ایک نہایت قدیم معاہدہ مصر کے فرعون رمسیس دوم اور خیشتسین کے فرمانروا خیسنا کے درمیان تیرہویں صدی قبل مسیح میں طے پایا۔ اس معاہدے کی بنیاد جنگ کے بعد صلح پر رکھی گئی، جب ایک فریق نے شکست کے بعد مخصوص شرائط کے ساتھ امن کی درخواست کی۔ اس صلح نامے کو باقاعدہ تحریری شکل دی گئی، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس زمانے میں بھی بین الاقوامی تعلقات کو منظم کرنے کی کوششیں موجود تھیں۔

اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اگر کوئی شخص اپنے حکمران کے خلاف بغاوت کر کے کسی دوسرے ملک میں پناہ لے، تو پناہ دینے والی ریاست پر لازم ہوگا کہ وہ اسے واپس اس کے ملک کے حوالے کرے۔ یہی تصور بعد میں مجرموں کی حوالگی (extradition) کے اصول کی بنیاد بنا، جو آج بھی بین الاقوامی قانون کا ایک اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم حسن نے ہیروغلیفیہ کی تحریر (جو مصر کی قدیم عبادت گاہوں میں اب بھی موجود ہے) سے اقتباس کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اس معاہدہ کو مع شرائط نقل کیا ہے۔ حوالہ انگریزی کتاب مصر القدیمہ قدیم یونان میں مختلف شہر ریاستیں جیسے اسپارٹا، ایتھنز اور دیگر علاقے اپنی اپنی سیاسی خودمختاری رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود ان کے درمیان ایک خاص نوعیت کا اتحاد موجود تھا۔ یہ اتحاد مشترکہ زبان، ادب، تہذیب، ثقافت اور بعض مذہبی اقدار کی بنیاد پر قائم تھا۔ اسی باہمی ربط نے ابتدائی سطح پر ایسے اصولوں کو جنم دیا جنہیں آج ہم بین الاقوامی قانون کی ابتدائی شکل قرار دے سکتے ہیں۔

اسی طرح قدیم روم اور اس کے گردونواح کے دیہات، قصبے اور قبائل کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ ان کے درمیان اکثر جھگڑے اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں، اور رومی اس تمام صورتحال میں ایک طاقتور اور فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ چونکہ روم ایک غالب قوت تھی، اس لیے مختلف قبائل اور علاقے اپنے تنازعات کے حل کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعض قوموں نے تو رومی اقتدار کو باقاعدہ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ یہاں سے یہ تصور ابھرنے لگا کہ چھوٹی ریاستیں ایک بڑی اور مضبوط حکومت کے زیرِ اثر آ سکتی ہیں۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات اور سیاسی نظم و نسق کے اصول عہدِ وسطیٰ سے بھی پہلے موجود تھے۔ عہدِ وسطیٰ کی مدت کے بارے میں اکثر مورخین کا خیال ہے کہ اس کا آغاز 476 عیسوی میں مغربی رومی سلطنت کے زوال سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام 1453 عیسوی میں قسطنطنیہ کی فتح پر ہوتا ہے، جب عثمانی سلطان محمد فاتح نے مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ کیا۔

اسلام کا ظہور بھی اسی تاریخی دور میں ہوا، جب 571 عیسوی میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی اور 611 عیسوی میں آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ یوں اسلامی تعلیمات نے ایک ایسے زمانے میں جنم لیا جب دنیا پہلے ہی مختلف سیاسی اور بین الاقوامی تصورات سے گزر رہی تھی، اور بعد میں انہی تصورات کو اسلام نے ایک منظم، عادلانہ اور اخلاقی بنیاد فراہم کی۔[1]

قدیم یونان میں مختلف شہر ریاستیں جیسے اسپارٹا، ایتھنز اور دیگر علاقے اپنی اپنی سیاسی خودمختاری رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود ان کے درمیان ایک خاص نوعیت کا اتحاد موجود تھا۔ یہ اتحاد مشترکہ زبان، ادب، تہذیب، ثقافت اور بعض مذہبی اقدار کی بنیاد پر قائم تھا۔ اسی باہمی ربط نے ابتدائی سطح پر ایسے اصولوں کو جنم دیا جنہیں آج ہم بین الاقوامی قانون کی ابتدائی شکل قرار دے سکتے ہیں۔

اسی طرح قدیم روم اور اس کے گردونواح کے دیہات، قصبے اور قبائل کے درمیان تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہے۔ ان کے درمیان اکثر جھگڑے اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں، اور رومی اس تمام صورتحال میں ایک طاقتور اور فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ چونکہ روم ایک غالب قوت تھی، اس لیے مختلف قبائل اور علاقے اپنے تنازعات کے حل کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعض قوموں نے تو رومی اقتدار کو باقاعدہ تسلیم بھی کر لیا تھا۔ یہاں سے یہ تصور ابھرنے لگا کہ چھوٹی ریاستیں ایک بڑی اور مضبوط حکومت کے زیرِ اثر آ سکتی ہیں۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات اور سیاسی نظم و نسق کے اصول عہدِ وسطیٰ سے بھی پہلے موجود تھے۔ عہدِ وسطیٰ کی مدت کے بارے میں اکثر مورخین کا خیال ہے کہ اس کا آغاز 476 عیسوی میں مغربی رومی سلطنت کے زوال سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام 1453 عیسوی میں قسطنطنیہ کی فتح پر ہوتا ہے، جب عثمانی سلطان محمد فاتح نے مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ کیا۔

اسلام کا ظہور بھی اسی تاریخی دور میں ہوا، جب 571 عیسوی میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی اور 611 عیسوی میں آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ یوں اسلامی تعلیمات نے ایک ایسے زمانے میں جنم لیا جب دنیا پہلے ہی مختلف سیاسی اور بین الاقوامی تصورات سے گزر رہی تھی، اور بعد میں انہی تصورات کو اسلام نے ایک منظم، عادلانہ اور اخلاقی بنیاد فراہم کی۔ ان تاریخی مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بین الاقوامی قانون کا تصور کسی نہ کسی صورت میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا،

CC BY

تاہم یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد دنیا کے مختلف خطوں میں جہاں کہیں بھی بین الاقوامی تعلقات کے اصول سامنے آئے، وہاں اسلامی تعلیمات کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ضرور دیکھے جاسکتے ہیں۔

جب اسلام کا آغاز ہوا تو اس وقت دنیا شدید انتشار اور باہمی اختلافات کا شکار تھی۔ خاص طور پر مسیحی دنیا میں مذہبی پیشوا اور ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھیں، جس کی وجہ سے معاشرتی اور سیاسی عدم استحکام بڑھتا جارہا تھا۔ ایسے ماحول میں اسلام نے انسانیت کو ایک جامع ضابطۂ حیات پیش کیا، جس میں عدل، محبت، اور باہمی احترام جیسے اصولوں کو بنیادی اہمیت دی گئی۔

بعد ازاں جب اسلام اپنی مضبوط تعلیمات اور فطری کشش کی بنا پر تیزی سے پھیلنے لگا، تو یورپ میں مسیحی قیادت کو اس صورت حال کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے باہمی اختلافات کو کم کرنے اور ایک مشترکہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے یورپی سطح پر ایک مشترکہ مجلس تشکیل دی گئی، جس کا کام مختلف ریاستوں کے درمیان خارجی تنازعات کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس مجلس کی سربراہی پوپ کے سپرد کی گئی، اور اسی دور میں

پوپ کی باقاعدہ تاج پوشی کی روایت بھی قائم ہوئی۔

یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات نے نہ صرف اپنے ماننے والوں بلکہ دیگر اقوام کے سیاسی و قانونی نظاموں کو بھی بالواسطہ طور پر متاثر کیا، اور

بین الاقوامی سطح پر نظم و ضبط قائم کرنے کے رجحان کو تقویت دی۔

"اسلامی قانونِ بین الممالک (سِیَر) کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ محض اخلاقی نصیحت نہیں بلکہ ایک قانونی ضابطہ ہے جو ریاست کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا دامن نہ چھوڑے۔ اسلام نے غیر جانبدار ملکوں (Neutral States) کے حقوق کا تصور اس وقت

دیا جب دنیا اس سے ناواقف تھی۔"[2]

خدائی جنگ بندی کا قانون

یورپ میں ایک مجلس نے بعض بین الاقوامی قوانین مرتب کیے جن میں "خدائی جنگ بندی" کا اصول بھی شامل تھا، جس کے تحت مخصوص دنوں میں جنگ ممنوع قرار دی گئی۔ تاہم اس نوعیت کے اصول اسلام میں صدیوں پہلے سے موجود تھے۔ اسلام نے مکہ مکرمہ اور اس کے گردونواح کو "حرم" قرار دے کر اسے مکمل امن کا علاقہ بنایا، جہاں کسی قسم کی خونریزی کی اجازت نہیں۔

قرآن مجید میں اس امن کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ۔[3]

ترجمہ: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے (مکہ کو) پرامن حرم بنا دیا ہے، جبکہ اس کے اردگرد لوگوں کو اچک لیا جاتا ہے۔"

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا۔[4]

ترجمہ: "اور (یاد کرو) جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے رجوع کرنے کی جگہ اور امن کا مقام بنایا۔"

وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا۔[5]

ترجمہ: "اور جو شخص اس (حرم) میں داخل ہو جائے، وہ امن پا جاتا ہے۔"

أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ۔ [6]

ترجمہ: "کیا ہم نے ان کے لیے ایک پرامن حرم مہیا نہیں کیا، جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں؟"

اسی طرح اسلام نے بعض مہینوں کو بھی خاص حرمت عطا کی ہے:

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ۔[7]

ترجمہ: "بے شک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ ہے، اللہ کی کتاب میں، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے، پس ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔"

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے بہت پہلے ہی امن، جنگ کی حدود اور انسانی جان کے احترام کے اصول مقرر کر دیے تھے، جن کی جھلک بعد کے عالمی قوانین میں بھی نظر آتی ہے۔

مولانا مودودی نے بین الاقوامی قانون میں 'وفائے عہد' (معاہدوں کی پاسداری) پر بحث کی ہے۔

"اسلامی بین الاقوامی قانون کا سب سے مضبوط ستون 'عہد کی پابندی' ہے۔ قرآن کی رو سے بین الاقوامی معاہدات کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمان مقیم ہوں اور ان پر ظلم ہو رہا ہو، تب بھی اسلامی ریاست ان کی مدد کے لیے اس ملک پر حملہ نہیں کر سکتی اگر اس ملک کے ساتھ اس کا امن کا معاہدہ موجود ہو۔"[8]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یورپ کی مجلسِ متحدہ نے "حدنۃ الرب" یا "صلحِ الٰہی" کے نام سے جو قانون مرتب کیا، وہ درحقیقت اسلامی قانون کے اسی اصول سے ماخوذ تھا۔ خاص طور پر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یورپی ممالک کے اسلامی اندلس کے ساتھ گہرے علمی، تہذیبی اور جغرافیائی روابط موجود تھے۔ ایسے میں یہ بعید از قیاس ہے کہ یورپ کے قانون ساز قرآن کے اس معروف حکم اور عربوں کے اس رائج دستور سے ناواقف رہے ہوں۔ سمندر کی آزادی کا نظریہ سمندر کی آزادی کا نظریہ درحقیقت کوئی جدید تصور نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات میں صدیوں پہلے اس کی عملی بنیاد موجود رہی ہے۔ تاریخ اسلام میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ایک اہم واقعہ اس حوالے سے نمایاں ہے۔ شمالی افریقہ کے گورنر نے ان سے اجازت طلب کی کہ یورپ کی طرف جانے والی تجارتی کشتیوں پر پابندی عائد کی جائے اور ان سے محصول (کسٹم) وصول کیا جائے، مگر انہوں نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور واضح فرمایا کہ سمندر سب کے لیے آزاد ہیں اور ان کے ذریعے ہونے والی تجارت پر کسی قسم کا ٹیکس عائد نہیں ہونا چاہیے۔

یہ اصول دراصل قرآن مجید کی تعلیمات سے ماخوذ ہے، جہاں سمندر کو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک مشترکہ نعمت قرار دیا گیا ہے:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔[9]

ترجمہ: "وہی اللہ ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ، اس میں سے زیورات نکالو جنہیں تم پہنتے ہو، اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اسے چیرتی ہوئی چلتی ہیں، تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار بنو۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔[10]

ترجمہ: "اور دونوں سمندر برابر نہیں ہیں، ایک میٹھا اور خوشگوار ہے جس کا پانی پینے میں آسان ہے، اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے، مگر تم دونوں میں سے تازہ گوشت حاصل کرتے ہو اور زیورات نکالتے ہو جنہیں تم پہنتے ہو، اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ ان میں پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں، تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور شکر ادا کرو۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ٹیکس کے بارے میں بھی سخت موقف اختیار کیا اور فرمایا: "اِنَّ الْمَکْسَ ظُلْمٌ" یعنی ناجائز ٹیکس لوگوں کے مال کو ناحق لینے کے مترادف ہے۔

اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ۔[11]

ترجمہ: "اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو (یعنی ان کے حقوق میں کمی نہ کرو)۔"

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (Mufti Muhammad Taqi Usmani) جدید دور میں اسلامی ریاست کے عالمی تعلقات پر آپ کی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ "اسلامی قانون کی رو سے جنگ صرف میدانِ کارزار تک محدود رہنی چاہیے۔ شہری آبادی، فصلیں، درخت اور عبادت گاہیں جنگی کارروائیوں سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جنہیں آج 'انسانی حقوق کا بین الاقوامی قانون' (International Humanitarian Law) کہا جاتا ہے، لیکن اسلام نے انہیں چودہ سو سال پہلے مذہبی فریضہ بنا دیا تھا۔"[12]

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ سمندری آزادی اور بین الاقوامی تجارت کے اصول اسلام میں نہایت قدیم اور مضبوط بنیاد رکھتے ہیں۔ مغربی دنیا میں یہ تصورات اگرچہ چند صدیوں قبل باقاعدہ قانون کی شکل میں سامنے آئے، لیکن اسلامی تعلیمات میں یہ اصول بہت پہلے سے موجود تھے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ بعد کے مغربی قوانین کسی نہ کسی درجے میں اسلامی اصولوں سے متاثر ہوئے ہوں گے۔[13]

ایک جاہلانہ اصول

یورپ کی سیاسی فکر میں Niccolò Machiavelli (میکیاولی) ایک نمایاں نام ہے، جسے جدید سیاسی نظریات کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اس دور میں جب یورپ اسلامی فتوحات اور ان کے اثرات سے خوفزدہ تھا، مذہبی بنیادوں کے بجائے ایک خالص سیاسی نظام قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مختلف چھوٹی ریاستیں اگر ایک بڑی سیاسی طاقت میں ضم ہو جائیں تو وہ ایک مضبوط قوت بن سکتی ہیں۔

میکیاولی نے اپنے نظریات کی وضاحت اپنی مشہور کتاب The Prince (الامیر) میں کی۔ اس کتاب میں اس نے سیاست کو اخلاقیات سے الگ کر کے پیش کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ:

یاست میں سچ اور جھوٹ کی کوئی قطعی حیثیت نہیں 1

وعدے اور معاہدے حالات کے تابع ہوتے ہیں-

طاقت ہی اصل حق ہے (جس کی لاٹھی اس کی بھینس)

ایک ریاست دوسری ریاست پر طاقت کے ذریعے قبضہ کرے تو اسے ناجائز نہیں کہا جاسکتا

یہ نظریات ایک عرصے تک یورپی سیاست پر اثرانداز رہے، لیکن ان کے نتیجے میں بداعتمادی، جنگ اور فساد میں اضافہ ہوا۔ بالآخر یہ محسوس کیا گیا کہ اگر سیاست کو مکمل طور پر اخلاقیات سے جدا کر دیا جائے تو عالمی امن قائم نہیں رہ سکتا۔

اسی پس منظر میں یورپ میں ایک نئے تصور نے جنم لیا، جسے "قانونِ امن" اور "منصفانہ جنگ (Just War)" کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق:

جنگ صرف مجبوری میں ہونی چاہیے

اس کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہونا چاہیے

تمام ریاستیں اس کی پابند ہوں

اس فکر کو آگے بڑھانے والوں میں چند اہم نام شامل ہیں:

Francisco de Vitoria

یہ سپین کا ایک معروف پادری اور عالم تھا، جس نے University of Salamanca میں 1480ء سے 1546ء تک الٰہیات پڑھائی۔ اس نے بین الاقوامی قانون اور انصاف پر مبنی جنگ کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔

Francisco Suárez یہ بھی سپین کا بڑا عالم تھا اور University of Paris میں پروفیسر رہا۔ اس نے ریاست، قانون اور اخلاقیات کے تعلق کو مزید واضح کیا۔

Hugo Grotius اسے جدید بین الاقوامی قانون کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے پہلے مفکرین کے خیالات کو منظم شکل دی اور اپنی مشہور کتاب De Jure Belli ac Pacis (قانونِ جنگ و امن) میں ایک مکمل نظریہ پیش کیا۔ اسی کے ساتھ اس کی ایک اور اہم کتاب Mare Liberum (البحر الحر) ہے، جس میں اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ:

سمندر کسی ایک ریاست کی ملکیت نہیں

تمام اقوام کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے

CC BY

اس نظریے کی United Kingdom نے مخالفت کی اور اس کے جواب میں "البحر المغلق (Mare Clausum) "کا نظریہ پیش کیا، جس میں سمندروں پر ریاستی کنٹرول کی حمایت کی گئی۔

اگر اس پورے تاریخی پس منظر کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں بین الاقوامی قانون اور امن کے تصورات دراصل ایک ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوئے۔ میکیاولی کی طاقت پر مبنی سیاست نے جہاں انتشار کو بڑھایا، وہیں بعد کے مفکرین نے اخلاقیات، انصاف اور قانون کو دوبارہ سیاست کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام میں یہ اصول پہلے ہی موجود تھے، جیسے:

جنگ میں حدود و قیود (بے گناہوں کو نقصان نہ پہنچانا)

معاہدوں کی پابندی

ظلم اور جارحیت کی ممانعت

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کی بہت سی بنیادیں یا تو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں یا کم از کم ان کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

سلامی تعلیمات نے بین الاقوامی قوانین میں سب سے پہلے عدل و انصاف اور انسانیت کے احترام کو بنیادی اصول کے طور پر متعارف کروایا۔ فقہ اسلامی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جنگ صرف ضرورت کے تحت ہو سکتی ہے اور اس میں بھی اخلاقی حدود کی پابندی لازم ہے، جیسے بے گناہ افراد کو نقصان نہ پہنچانا۔ یہ اصول بعد میں عالمی قوانین میں انسانی حقوق کی بنیاد بنے۔[14]

دور کلیسا کا خاتمہ

یورپ میں ایک عرصے تک ایک ایسی مجلس کا اقتدار قائم رہا جس کی قیادت پوپ کے ہاتھ میں تھی، اور اس دور کو دراصل کلیسائی حکمرانی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اقتدار زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی بڑی وجہ کلیسا کے بعض ایسے اقدامات تھے جنہوں نے حکمرانوں اور اشرافیہ کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت اور بیزاری پیدا کر دی۔ کلیسا نے نہ صرف سیاسی معاملات میں حد سے زیادہ مداخلت کی بلکہ مسیحی تعلیمات میں بھی تبدیلیاں کیں، جو لوگوں کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ مثال کے طور پر، گناہوں کی معافی کے نام پر دستاویزات (indulgences) فروخت کی جانے لگیں، جو مذہب کو ایک طرح سے کاروبار بنا دینے کے مترادف تھا۔ اسی طرح، جو لوگ کلیسا کی مخالفت کرتے، انہیں سخت سزائیں دی جاتیں، جیسے معاشرتی بائیکاٹ، مذہبی طور پر جنت سے محرومی کا اعلان، اور بعض صورتوں میں قتل تک کی اجازت دینا۔

مزید یہ کہ کلیسا اپنے مفادات کے لیے معاہدات کی پاسداری کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔ اگر کوئی فریق اس کی مخالفت کرتا، تو وہ معاہدوں کو منسوخ کر کے انہیں کالعدم قرار دے دیتا۔ ان تمام رویّوں نے کلیسا کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا اور بالآخر اس کے اقتدار کے زوال کا سبب بنے۔

قواعدِ جنگ (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

اسلام اور یورپ کے درمیان ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی تک طویل کشمکش اور مسلسل جنگوں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل تعامل کے دوران یورپ کو اسلامی قوانینِ جنگ کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا، خصوصاً بیت المقدس کی صلیبی جنگیں اس حوالے سے نہایت اہم تھیں۔ ان جنگوں کے ذریعے مغربی مؤرخین اور مفکرین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ اسلام نے جنگ کے دوران بھی اعلیٰ اخلاقی اور قانونی اصول قائم کیے۔

مسلمانوں کے طرزِ عمل سے یورپی اقوام نے درج ذیل اصول سیکھے:

جنگ کا دائرہ محدود ہونا چاہیے

جنگ صرف میدانِ جنگ تک محدود ہو اور باقاعدہ فوجوں کے درمیان ہو۔ عام شہریوں کو کسی قسم کی اذیت یا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

برصغیر کے علماء نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام نے جنگی قوانین میں وہ اعتدال پیدا کیا جو اس سے قبل دنیا میں موجود نہ تھا۔ مثلاً قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک، زخمیوں کی مدد، اور عام شہریوں کی حفاظت جیسے اصول واضح طور پر اسلامی شریعت میں بیان ہوئے، جو بعد میں عالمی سطح پر تسلیم کیے گئے۔[15]

سلامی قانون نے بین الاقوامی تعلقات میں امن کو اصل اور جنگ کو استثنا قرار دیا ہے۔ برصغیر کے محققین کے مطابق اسلام نے سفارت کاری، صلح، اور بقائے باہمی کے اصولوں کو فروغ دیا، جس سے جدید عالمی نظام میں پر امن بقائے باہمی (peaceful coexistence) کا تصور مضبوط ہوا۔[16]

CC BY

املاک اور عوام کا تحفظ

اسلام گھروں کو تباہ کرنے، املاک کو نقصان پہنچانے اور بے گناہ لوگوں کو تکلیف دینے کی اجازت نہیں دیتا، حتیٰ کہ قیدیوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے۔

معاہدات کی پابندی

اسلام نے ریاستوں کے درمیان معاہدات کی پاسداری کو نہایت اہم قرار دیا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں یہ اصول دیا گیا کہ کسی بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی جائے، چاہے وہ دشمن کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی تصور بعد میں بین الاقوامی قانون میں treaty obligations کی صورت میں نمایاں ہوا۔[17]

اسلام میں کیے گئے معاہدوں اور امن کے وعدوں کی مکمل پاسداری لازم ہے، اور کسی بھی صورت میں ان کی خلاف ورزی جائز نہیں۔

مذاہب کا احترام اور دیانتداری

اسلامی تعلیمات میں رواداری (Tolerance) اور مذاہب کے احترام کو ایک بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات میں زبردستی کے بجائے عدل، احسان اور برداشت کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاستوں میں مختلف مذاہب کے لوگ نہ صرف اپنے عقائد پر قائم رہے بلکہ انہیں مکمل مذہبی آزادی اور سماجی تحفظ بھی حاصل رہا۔ اس اصول نے بعد میں بین الاقوامی قوانین میں مذہبی آزادی اور بقائے باہمی کے نظریات کو متاثر کیا۔[18]

جدید تحقیقی مطالعات سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام نے مذہبی رواداری کو صرف ایک نظری تصور کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے عملی سطح پر نافذ کیا۔ مسلم حکمرانوں کے ادوار میں غیر مسلموں کو قانونی تحفظ، معاشی حقوق اور مذہبی آزادی دی گئی، جس کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پایا جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے پر امن طور پر رہتے تھے۔ یہ طرزِ عمل بعد میں انسانی حقوق اور بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں میں شامل ہوا۔[19]

بین المذاہب مکالمہ اور مختلف مذاہب کے مطالعے کو فروغ دینا بھی اسلامی روایت کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ علماء نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ دیگر مذاہب کو سمجھنے اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کرنے سے معاشرے میں امن اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس علمی و فکری رویے نے نہ صرف مسلم معاشروں کو وسعت دی بلکہ عالمی سطح پر بین الاقوامی تعلقات اور قانون سازی میں رواداری، مکالمہ اور باہمی احترام کے اصولوں کو فروغ دیا۔[20]

کمزور طبقات کا تحفظ

اسلام نے انسانیت کے عالمی تصور کو فروغ دیا، جس میں رنگ، نسل اور قومیت سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا۔ یہی اصول بعد میں بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین میں شامل ہوئے، اور برصغیر کے علماء نے اسے اسلامی تعلیمات کا ایک نمایاں عالمی اثر قرار دیا ہے۔[21]

بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور محنت کش افراد کو قتل کرنا سختی سے منع ہے۔

زرعی اور معاشی نظام کا تحفظ

کھیتوں، فصلوں اور درختوں کو تباہ کرنا ممنوع ہے، اور دشمن کی لاش کی بے حرمتی (مثلہ کرنا، ناک کان کاٹنا وغیرہ) بھی ناجائز ہے۔

یہ اصول قرآن، احادیث اور فقہی کتب (خصوصاً کتاب السیر اور کتاب الجہاد) میں واضح طور پر بیان ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس، تاریخ میں بعض صلیبی حکمرانوں نے ان اصولوں کی شدید خلاف ورزی کی۔ مثال کے طور پر، Richard the Lionheart نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد امان دینے کے باوجود ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر دیا، جس کا ذکر مغربی مؤرخین جیسے Joseph François Michaud نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

اسی طرح دیگر مؤرخین نے بھی لکھا ہے کہ صلیبیوں نے بیت المقدس پر حملے کے دوران نہایت ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا۔

OPEN ACCESS

اس کے برعکس، جب Salah ad-Din Ayyubi (سلطان صلاح الدین ایوبی) نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انہوں نے انتقام لینے کے بجائے عام معافی (امنِ عام) کا اعلان کیا اور اس پر سختی سے عمل بھی کیا۔ ان کے بھائی Al-Adil I نے ہزاروں قیدیوں کو رہا کیا، عیسائی پادریوں کو مذہبی رسومات ادا کرنے کی اجازت دی، اور عورتوں کو اپنے خاندانوں سے ملنے کی سہولت فراہم کی۔

یہ تمام واقعات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے جنگ جیسے مشکل حالات میں بھی انسانیت، عدل اور علمی و تمدنی اثرات رحم کے اصولوں کو برقرار رکھا، جبکہ عملی میدان میں بھی ان اصولوں کی بہترین مثالیں پیش کی گئیں

علمی و تمدنی اثرات

اسلامی علمی مراکز، خصوصاً بغداد، قرطبہ اور قاہرہ، ایسے بین الاقوامی علمی و تمدنی مراکز تھے جہاں مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگ اکٹھے ہو کر تحقیق و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ اس اشتراکِ عمل نے نہ صرف علم کو وسعت دی بلکہ مختلف تہذیبوں کے درمیان قانونی اور اخلاقی تصورات کے تبادلے کو بھی ممکن بنایا۔ یورپ نے اسی علمی ورثے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے قانونی نظام کو ترقی دی، جس میں انصاف، مساوات اور انسانی وقار جیسے اصول نمایاں ہوئے۔[22]

اسلامی قانون میں بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا، جن میں دشمن کے ساتھ بھی عدل، قیدیوں کے حقوق، اور معاہدات کی پابندی کو لازم قرار دیا گیا۔ یہ اصول اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اسلام نے جنگ کو بھی اخلاقی حدود کا پابند بنایا، جو بعد میں یورپی مفکرین اور قانون دانوں کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوا۔ اس طرح اسلامی تعلیمات نے عالمی سطح پر قانون سازی کے ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کیا۔[23]

یہ حقیقت تاریخی طور پر بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یورپ نے نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں اسلامی علوم، فلسفہ اور قانون سے گہرا اثر قبول کیا۔ مسلم مفکرین کی تصانیف کے تراجم نے یورپی جامعات میں قانون اور فلسفہ کی تعلیم کو نئی جہت دی، جس کے نتیجے میں بین الاقوامی قوانین کی تشکیل میں انسانی حقوق، انصاف اور رواداری کے اصول مضبوط ہوئے۔[24]

یہ واقعہ ایک عینی شاہد کی زبانی بیان کیا گیا ہے، جو خود اس جنگ میں شریک تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ مسلمان وہ لوگ تھے جن کے خاندانوں کو پہلے خود ان کے دشمنوں نے شدید ظلم کا نشانہ بنایا تھا—ان کے باپ دادا کو قتل کیا گیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو تکلیفیں دی گئیں، ان کے مال و اسباب کو لوٹا گیا اور انہیں گھروں سے بے دخل کر دیا گیا۔

لیکن جب حالات بدل گئے اور مسلمان غالب آ گئے، تو انہوں نے بدلہ لینے کے بجائے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنے قیدیوں کے ساتھ نہایت رحم و کرم کا سلوک کیا، ان کی ضروریات پوری کیں، بھوک کے وقت انہیں کھانا کھلایا، اور ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ یہاں تک کہ اگر کسی قیدی کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو وہ اسے واپس دلانے کی کوشش کرتے۔ اس حسنِ سلوک نے دشمنوں کے دلوں پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ خود مسلمانوں کے احسان کے معترف ہو گئے۔

اسی طرح مؤرخ Gustave Le Bon (جوستاولوبون) اپنی کتاب حضارتِ عرب میں لکھتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ تہذیب دراصل عربوں کی مرہونِ منت ہے۔ نویں اور دسویں صدی میں اسلامی تہذیب اپنے عروج پر تھی، جبکہ اس وقت یورپ علمی اعتبار سے بہت پیچھے تھا۔ وہاں تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے اور معاشرہ عمومی طور پر جہالت کا شکار تھا۔

جب گیارہویں صدی میں یورپ میں علم کا شعور بیدار ہونا شروع ہوا، تو انہوں نے مسلمانوں، خصوصاً اندلس، کی طرف رجوع کیا۔ 1130ء کے قریب اندلس کے ذریعے علم یورپ منتقل ہوا۔ اس سلسلے میں Raymond of Toledo (پادری ریمونڈ) نے طلیطلہ میں ایک دارالترجمہ قائم کیا، جہاں عربی اور یونانی کتب (جو پہلے عربی میں منتقل ہو چکی تھیں) کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

مورخ Reinhart Dozy کے مطابق یورپ کے لوگ مسلمانوں کی علمی برتری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی مقامی زبانیں چھوڑ کر عربی سیکھنا شروع کر دی۔ حتیٰ کہ پادری اور مذہبی شدت پسند بھی عربی زبان اور اسلامی علوم کے حصول میں لگ گئے۔ اسپین کے مختلف شہروں میں قائم مسلم جامعات میں یورپی طلبہ باقاعدہ داخلہ لیتے تھے۔

CC BY

مزید یہ کہ بعض یورپی حکمران بھی اسلامی علوم سے متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر Roger II of Sicily نے نباتات اور حیوانات کے علوم سیکھے، جبکہ Frederick II (جو "حکیم" کے لقب سے معروف تھا) نے عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم حاصل کیے اور قرآن کریم سمیت کئی علمی کتب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ دیگر حکمرانوں نے بھی اسی طرز کو اپنایا۔

مغربی قانون پر اسلامی قانون کے اثرات پڑے ہیں اگرچہ بحث کے اس پہلو کو مغربی قانون دانوں اور مورخین نے نظر انداز کر دیا ہے لیکن بعض انصاف پسند محققین نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے مثلاً مشہور مستشرق پروفیسر ڈیوڈ ڈی سانتی لانس۔ Santi-D-David نے اپنی مشہور کتاب۔ The legacy of islam میں لکھتے ہیں عربی قانون سے جو چیزیں اہل یورپ نے قطعی طور پر لی ہیں ان میں بعض قانونی ادارے ہیں عربی جیسے محدود شرکت اور بعض تجارتی قوانین کے اصطلاحات لیکن اگر ان کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی قانون کے بعض اعلی معیاری اجزاء نے موجودہ یورپین تصورات کے نشوو ارتقا میں مفید حصہ لیا ہے اور یہیں سے اس کی فضیلت اور برتری کا ثبوت ملتا ہے۔[25]

اسلام ایک ایسا ہمہ گیر دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جو پوری انسانیت کے لیے فطری قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے احکام، اصول اور جزئیات کا جب بھی غیر جانب دار اور انصاف پسند محقق گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسلام میں ایسی جامعیت اور توازن پایا جاتا ہے جس کی مثال کسی اور مذہب یا قانونی نظام میں نہیں ملتی۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ صدیوں سے مختلف اقوام اور مفکرین قانون سازی کے میدان میں کوشاں رہے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کسی نہ کسی درجے میں الہامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کی، لیکن اس کے باوجود وہ ایسا مکمل اور جامع قانون پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جو ہر لحاظ سے کامل ہو، ناقابلِ ترمیم ہو اور انسانی جذبات و اعمال کی پوری طرح ترجمانی کرتا ہو۔ یہ خصوصیت صرف اسلامی قانون کو حاصل ہے، جو خود اپنی تکمیل اور ابدیت کا اعلان کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے:

"اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً"۔[26]

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔"

اسی طرح قرآن اپنے جامع اور ہمہ گیر ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ونزلنا عليك الكتاب تبياناً لكل شيء وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين"۔[27]

ترجمہ: "اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا واضح بیان ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔"

مزید برآں، قرآن اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس میں انسانی رہنمائی کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کر دی گئی ہیں تاکہ ہر زمانے اور ہر حالت میں اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکے:

"ولقد ضربنا للناس في هذا القرآن من كل مثل"۔[28]

ترجمہ: "اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں۔"

ان آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید نہ صرف ایک مکمل ضابطۂ حیات فراہم کرتا ہے بلکہ ہر دور کے حالات و واقعات کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس کے اصول ایسے جامع اور آفاقی ہیں کہ ہر زمانے کے انسان اپنے مسائل کا حل اس میں تلاش کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون کو ایک ابدی اور ناقابلِ تنسیخ نظام قرار دیا جاتا ہے، جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

۔اصولوں کی مثال قائم کی بلکہ علم، تہذیب اور تمدن کے میدان میں بھی دنیا، خصوص مغربی دنیا کے ماہرینِ قانون نے بھی اپنے مطالعے اور تجربے کی بنیاد پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ شریعتِ اسلامی میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل اور پیچیدہ معاملات کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ اسلامی قانون نہ صرف ایک مذہبی نظام ہے بلکہ ایک ایسا مؤثر قانونی ڈھانچہ بھی ہے جو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔

cc BY

اسی اعتراف کے نتیجے میں متعدد بین الاقوامی سطح کی کانفرنسوں میں باقاعدہ قراردادیں منظور کی گئیں، جن میں شریعتِ اسلامی کو قانون سازی کے اہم مصادر میں سے ایک تسلیم کیا گیا۔ ماہرین نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی قانون میں ارتقاء اور اجتہاد کی ایسی صلاحیت پائی جاتی ہے جو اسے ہر دور کے نئے مسائل سے ہم آہنگ کر سکتی ہے۔

اس سلسلے میں پہلی اہم قرارداد 1931ء میں The Hague میں International Congress of Comparative Law کے موقع پر منظور کی گئی، جس میں شریعتِ اسلامی کی قانونی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ بعد ازاں 1937ء میں اسی شہر میں منعقد ہونے والی دوسری کانفرنس میں اس مؤقف کی تجدید کی گئی اور اسلامی قانون کی افادیت کو دوبارہ واضح کیا گیا۔ مزید برآں، 1948ء میں وکلاء کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں بھی اسی نوعیت کی قرارداد منظور کی گئی، جس میں اس امر پر زور دیا گیا کہ شریعت اسلامی ایک جامع اور مؤثر قانونی ماخذ ہے اور اس میں جدید تقاضوں کے مطابق قانون سازی کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

ان عالمی اعترافات سے یہ بات مزید مستحکم ہو جاتی ہے کہ اسلامی قانون محض ایک نظریاتی نظام نہیں بلکہ ایک عملی، جامع اور قابلِ نفاذ ضابطۂ حیات ہے، جسے دنیا کے ممتاز قانونی ماہرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اُیورپ، کی رہنمائی کی۔

خلاصہ بحث

اس مقالے کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بین الاقوامی قانون کا تصور محض جدید یورپی فکر کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی جڑیں انسانی تاریخ کے قدیم ادوار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قدیم مصر، یونان اور روم کی تہذیبوں میں بھی اقوام کے درمیان تعلقات، جنگ و امن کے اصول اور باہمی معاہدات کی ابتدائی شکلیں موجود تھیں، جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بین الاقوامی نظم و نسق کا تصور ہمیشہ سے انسانی معاشروں کا حصہ رہا ہے۔

تاہم اسلامی تعلیمات نے ان منتشر اور غیر منظم اصولوں کو ایک جامع، اخلاقی اور منظم قانونی نظام میں تبدیل کیا۔ قرآنِ مجید نے امن، عدل، رواداری اور مذہبی آزادی جیسے بنیادی اصول فراہم کیے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی نے ان اصولوں کو بین الاقوامی سطح پر نافذ کر کے دکھایا۔ اسلامی قانون میں معاہدات کی پابندی، دشمن کے ساتھ بھی انصاف، اور مقدس مقامات کے احترام جیسے اصول نہ صرف ایک اعلیٰ اخلاقی معیار قائم کرتے ہیں بلکہ جدید بین الاقوامی قوانین سے گہری مماثلت رکھتے ہیں۔

مزید برآں، عہدِ وسطیٰ میں جب یورپ فکری و سیاسی انتشار کا شکار تھا، اسلامی تہذیب علمی، قانونی اور تمدنی میدان میں ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ اسی دور میں یورپ نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلامی تعلیمات اور اصولوں سے اثر قبول کیا۔ بعد کے یورپی مفکرین جیسے میکیاولی، وکٹوریا اور گروشیئس نے اگرچہ اپنے نظریات کو ایک نئی شکل میں پیش کیا، لیکن ان کے خیالات میں بین الاقوامی قانون کے وہ بنیادی عناصر موجود تھے جو
اسلامی تعلیمات میں پہلے سے پائے جاتے تھے۔

لہٰذا یہ کہنا زیادہ قرینِ انصاف ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات نے ایک بنیادی اور مؤثر کردار ادا کیا۔ اسلام نے نہ صرف قدیم اصولوں کو منظم کیا بلکہ انہیں اخلاقی بنیاد فراہم کر کے ایک ایسے عالمی نظام کی راہ ہموار کی، جس کی جھلک آج کے بین الاقوامی قوانین اور
انسانی حقوق کے عالمی تصورات میں موجود ہے

اسلامی تعلیمات نے انسانی معاشرے کے تقریباً ہر پہلو کے لیے ایسے جامع اصول فراہم کیے ہیں، جنہوں نے بعد میں بین الاقوامی قوانین کی تشکیل میں رہنمائی کا کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے جان و مال کے تحفظ کا تصور اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جہاں ہر انسان کی زندگی، عزت اور ملکیت کو مقدس قرار دیا گیا۔ یہی اصول آج کے عالمی قوانین میں انسانی حقوق (Human Rights) کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی طرح معاہدات کی پابندی (پاسداریٔ عہد) کو اسلامی قانون میں نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی بار بار تاکید ملتی ہے، جس کے نتیجے میں بین الاقوامی تعلقات میں اعتماد، استحکام اور امن کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جدید عالمی قانون میں بھی Treaties اور Agreements کی پابندی اسی اصول کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔

مذہب کے احترام اور دیانتداری کے اصول بھی اسلامی تعلیمات کا نمایاں حصہ ہیں۔ اسلام نہ صرف مذہبی آزادی کا قائل ہے بلکہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے حقوق کے تحفظ پر بھی زور دیتا ہے۔ اسی طرح دیانتداری، انصاف اور شفافیت کو اجتماعی اور بین الاقوامی معاملات میں لازمی قرار دیا گیا، جو آج کے قانونی و اخلاقی نظام کا بنیادی ستون ہے۔

کمزور اور محروم طبقات کا تحفظ بھی اسلامی قانون کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یتیموں، مساکین، غلاموں اور اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں جو واضح ہدایات اسلام نے دیں، وہ بعد میں فلاحی ریاست (Welfare State) اور سماجی انصاف کے عالمی تصورات میں شامل ہوئیں۔ اسی طرح ذرائع (وسائل) اور معاشی نظام کے تحفظ کے لیے اسلام نے عدل، توازن اور استحصال سے بچاؤ کے اصول وضع کیے، جنہوں نے جدید معاشی قوانین اور بین الاقوامی اقتصادی نظم پر اثر ڈالا۔

علمی و تمدنی میدان میں بھی اسلام نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اسلامی تہذیب نے علم، تحقیق، اور بین الاقوامی علمی تبادلے کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں ایک ایسا عالمی فکری ماحول پیدا ہوا جس نے یورپ سمیت دیگر خطوں کو متاثر کیا۔ یہی اثرات بعد میں قانونی اور سیاسی نظریات کی تشکیل میں بھی ظاہر ہوئے۔

مزید یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر دین اور مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر سامنے آتا ہے، جو صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی معاملات کے لیے بھی مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسی جامعیت کے باعث اسلامی قانون کو عالمی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا، جس کا اظہار 1931ء میں منعقد ہونے والی "international Congress of comparative law کی قرارداد سے ہوتا ہے، جس میں اسلامی قانون کی قانونی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ بعد ازاں اسی نوعیت کی قراردادوں کی تجدید دیگر بین الاقوامی کانفرنسز (1948ء وغیرہ) میں بھی کی گئی، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ عالمی ماہرین قانون نے اسلامی تعلیمات کے اثرات کو تسلیم کیا۔

لہٰذا مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون نے نہ صرف ایک مثالی سماجی و اخلاقی نظام پیش کیا بلکہ بین الاقوامی قوانین کی تشکیل و ارتقاء میں بھی ایک بنیادی اور رہنما کردار ادا کیا، جس کے اثرات آج بھی عالمی قانونی نظام میں واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات

---

1 علی منصور مصری، شریعت اللہ شریعت الانسان، ص6

2 حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر۔ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی۔ اسلام آباد: معارفِ اسلامی، 1981ء۔ صفحہ نمبر 145۔

3 العنکبوت، ۲۹:۶۷۔

4 البقرہ، ۲:۱۲۵۔

5 آلِ عمران، ۳:۹۷۔

6 القصص، ۲۸:۵۷۔

7 التوبہ، ۹:۳۶۔

8 مودودی، ابوالاعلیٰ، سید۔ الجہاد فی الاسلام۔ لاہور: مرکزی مکتبہ اسلامی، 1991ء (پہلی اشاعت 1927ء)۔ صفحہ نمبر 210۔

9 النحل، ۱۶:۱۴۔

10 الفاطر، ۳۵:۱۲۔

11 الاعراف، ۷:۸۵۔

12 عثمانی، محمد تقی، مفتی۔ اسلام اور سیاستِ حاضرہ۔ کراچی: مکتبہ معارف القرآن، 2008ء۔ صفحہ نمبر 82۔

13 شریعت اللہ و شریعت الانسان، ص12۔

14 مودودی، سید ابوالاعلیٰ۔ اسلامی ریاست. لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 1967ء، ص321–323

15 منیب الرحمن، مفتی۔ اسلام اور انسانی حقوق. کراچی: نعیمی کتب خانہ، 2005ء، ص89–92۔

CC BY

16 ندوی، سید سلیمان۔ سیرت النبی ﷺ (جلد ششم)۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، 1974ء، ص412–415۔

17 عثمانی، مفتی تقی۔ اسلام اور جدید معاشی مسائل. کراچی: مکتبہ معارف القرآن، 2003ء، ص145–147۔

18 اکیوز، علی۔ اسلام میں رواداری کی تاریخی بنیادیں (استنبول: لاسٹ پروفیٹ پبلیکیشنز، 2010)، 75۔

19 حسن، ابو بکر کاوو، و دیگر۔ "اسلام اور مذہبی رواداری: تاریخی و عصری تناظر،" انٹرنیشنل جرنل آف ریسرچ اینڈ انوویشن اِن سوشل سائنس، 2024، ص134۔

20 قاسمی، ظفر دارق۔ "مطالعۂ مذاہب کے ذریعے رواداری کا فروغ: ایک علمی و تاریخی جائزہ،" نیوا تیج اسلام، 2025۔

21 مودودی، سید ابو الاعلیٰ۔ حقوق الانسان فی الاسلام. لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 1976ء، ص27–30۔

22 لبون، گستاو۔ تمدنِ عرب، ترجمہ (لاہور: مکتبہ خاور، 1956)، 412۔

23 خطیب بغدادی، ابو بکر احمد بن علی۔ تاریخ بغداد، جلد 1 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1931)، 56۔

24 براؤن، فلپ کے۔ اسلامی تہذیب کا یورپ پر اثر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1978)، 289

25 چراغ راہ: جلد ا / 191 بحوالہ رسالہ ترجمان القران ترجمہ مولوی ابو نصر خالدی

26 المائدہ، ۵:۳۔

27 النحل، ۱۶:۸۹۔

28 الروم، ۳۰:۵۸